امامتِ تامّہ

یا

خلافتِ راشدہ کی حقیقت

(ماخوذ از منصب امامت از شاہ اسمٰعیل شہیدؒ)

(مترجمہ نعیم صدیقی)

خلافتِ راشدہ کی دو قسمیں خلافتِ تامہ کی دوسری تعبیر خلافتِ راشدہ یا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ یا خلافتِ رحمت سے بھی کی جاتی ہے۔ اس منصب پر خلیفۂ راشد جب متمکن ہو گیا تو یہ قطعی ہے کہ نوعِ انسانی کی پرورش میں خدا تعالیٰ کی رحمت اپنے کمال کو پہنچ گئی لیکن اس رحمتِ ربانی کے کمالِ ظہور کے ساتھ اگر بندوں کے کمالِ روحانی کو بھی فروغ حاصل ہونے لگے تو پھر تو نورٌ علیٰ نور کا سماں بندھ جاتا ہے۔ اس نکتہ کی شرح یہ ہے کہ قیامِ خلافتِ راشدہ کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف سے تو رحمت و انعام کا اتمام ہو جاتا ہے لیکن اہل زمانہ کی سعادت اس بات میں ہے کہ پوری امت مسلمہ کامل اتفاق سے خلافتِ راشدہ کو قبول کرے اور خلیفۂ راشد کے اقتدار کو دل و جان سے تسلیم کرے۔ اگر اس طرح خلافتِ ربانی کا ضبط و نظم قائم ہو جائے تو سیاستِ ایمانی[1] کے معاملات صحیح طور پر تکمیل پذیر ہو سکتے ہیں۔ ایسی خلافت کو "خلافتِ منتظمہ" کہتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات زمانہ کے حالات کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ خلیفۂ راشد تو بروئے کار آ جاتا ہے اور خلافت کے قیام و حفظ کے لیے سرتوڑ کوشش بھی کرتا ہے، لیکن بدقسمتی سے جمہورِ اہل اسلام کی آرا کسی طرح ایک نقطہ پر مرتکز نہیں ہو پاتیں۔ یعنی پوری امت کی ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ پس خلافت کی اس صورت کو کہ خلیفۂ راشد کے موجود ہونے کے باوجود اور اس کی ساری سعیِ قیامِ خلافت کے باوجود نظمِ خلافت کی ہمواری حاصل نہیں ہوتی، "خلافتِ غیر منتظمہ" کہتے ہیں۔ سو اس طرح خلافتِ راشدہ کی دو قسمیں ہو گئیں:-

۱- خلافتِ منتظمہ، مثلاً خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی خلافت۔

۲- خلافتِ غیر منتظمہ، مثلاً حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت۔

---

[1] یہاں شاہ صاحبؒ نے جمہورِ مسلمین کے اتفاقِ آرا دربارۂ خلیفۂ اسلام کو جو اہمیت دی ہے اسے نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ اسی اہمیت کا اقتضا یہ ہے کہ حکومتِ الٰہیہ کا وہی خارجی ڈھانچہ قابلِ ترجیح ہے جس کے اندر جمہورِ مسلمین کی آرا کو دبانے کی جگہ ابھارنے کے سامان ہوں اور جس میں پراگندگیٔ افکار کے مقابلے میں ارتکازِ افکار کا زیادہ امکان ہو۔ اس کے خلاف کسی دوسری نوعیت کا خارجی ڈھانچہ جس میں امیر یا خلیفہ کے لیے رائے عامہ سے بے نیاز رہنے کی زیادہ گنجائش ہے، خلافتِ راشدہ کے حقیقی مدعا کے لیے سود مند نہیں ہے اور ایسے ڈھانچہ میں جو خلافت برسرِ عمل ہو گی وہ پہلے تو خلافتِ غیر منتظمہ کی شکل اختیار کرے گی اور پھر خلافتِ مفتونہ کی۔ (ن ۔ ص)

ثانی الذکر صورت میں خلیفۂ راشد کے ہوتے ہوئے شیرازۂ خلافت میں جو پراگندگی پائی جاتی ہے وہ اپنی ماہیت کے اعتبار سے کچھ ویسی ہی ہوتی ہے جیسے کسی رسول کی دعوتِ حق کے باوجود لوگوں میں ہدایت کا ظہور نہ ہو یا کم ہو۔ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا معاملہ لیجیے کہ سالہا سال کی سعیٔ ہدایت کے باوجود تھوڑے سے نفوس کے سوا کسی نے ان کی دعوت قبول نہیں کی۔ لیکن لوگوں کے دعوت قبول نہ کرنے سے حضرت نوح علیہ السلام کی رسالت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ بالکل اسی طرح اگر لوگ خلافت پر متفق نہ ہو سکیں تو اس سے خلیفۂ راشد کی حیثیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ پس خلافتِ غیر منتظمہ کو اگر خلیفۂ راشد کی موجودگی کے پہلو سے دیکھا جائے تو یہ خلافتِ راشدہ ہے۔ لیکن اگر اہلِ اسلام کے غیر متحد و غیر منتظم ہونے کا پہلو رکھا جائے تو یہ خلافتِ راشدہ نہیں ہے چنانچہ وہ پیشنگوئی جو حدیث "الخلافة بعدی ثلاثون سنة" (خلافت میرے بعد تیس سال تک رہے گی) میں وارد ہے پہلے نقطۂ نظر کے مطابق ہے۔ اور دوسری طرف جو احادیث حضرت ذی النورینؓ پر خلافت کے ختم ہو جانے کی خبر دیتی ہیں وہ دوسرے نقطۂ نظر کے ماتحت ہیں، مثلاً ابوبکر ثقفی سے روایت ہے:-

ان رجلا قال لرسول اللہ صلعم رأیت کان میزانا نزل من السماء فوزنت انت و ابوبکر فرجحت انت، ووزن ابوبکر و عمر فرجح ابوبکر ووزن عمر و عثمان فرجح عمر، ثم رفع المیزان۔ فاستأنها رسول اللہ صلعم۔ فقال خلافة نبوة ثم یؤتی اللہ الملک من یشاء

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں نے (خواب میں) دیکھا کہ گویا آسمان سے ایک ترازو اتری، تو آپ اور حضرت ابوبکرؓ اس میں تولے گئے تو آپ کا پلہ بھاری رہا، پھر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ تولے گئے تو حضرت ابوبکر کا پلڑا جھک گیا، پھر حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ تولے گئے تو حضرت عمر وزنی نکلے۔ اس کے بعد ترازو اٹھا لی گئی۔ اس پر آنحضور قدرے کبیدہ خاطر ہوئے اور (بطور تاویل) فرمایا یہ خلافت نبوت ہے۔ اس کے بعد اللہ جسے چاہے گا ملک دے دیگا۔

پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:-

أری اللیلة رجل صالح کان ابوبکر نیط برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ونیط عمر بابی بکر ونیط عثمان بعمر۔ قال جابر فلما قمنا من عند رسول اللہ صلعم، قلنا اما الرجل الصالح فرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واما نوط بعضهم ببعض فهم ولاة الامر الذی بعث اللہ بنبیه صلعم

ایک مردِ صالح کو خواب میں دکھایا گیا کہ حضرت ابوبکرؓ رسول اللہ صلعم کے ساتھ لٹکے ہوئے ہیں اور حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ اور حضرت عثمانؓ حضرت عمرؓ کے ساتھ۔ جابرؓ نے کہا جب ہم رسولؐ کی مجلس سے اٹھے تو ہم نے کہا کہ وہ مردِ صالح تو نبی صلعم ہیں۔ رہا ان حضرات کا ایک دوسرے سے لٹکنا تو یہ اس خلافت کے حاملین ہیں جسے لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے"۔

خلافتِ منتظمہ کی دو قسمیں

خود خلافتِ منتظمہ کی بھی دو حالتیں ہیں۔ کبھی تو خلیفۂ راشد کی عظمت لوگوں کے مختلف گروہوں کے نزدیک مسلّم اور ایسی زبان زدِ خاص و عام ہو جاتی ہے کہ نہ کسی کو اس کے تسلط سے کوئی عار لاحق ہوتی ہے اور نہ کسی کو اس کے خلاف قیل و قال کی کوئی گنجائش ملتی ہے۔ اس نوعیت کی خلافت کو "خلافتِ محفوظ" کہتے ہیں۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کو خلیفہ سے کوئی وجہ شکایت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اس پر نکتہ چینی کرنے لگتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی حفاظت و نصرت کی وجہ سے ان کی فتنہ انگیزی بغاوت کی حد

تک نہیں پہنچتی، یعنی دلوں کی کدورت، انقطاعِ بیعت پر منتج نہیں ہوتی اور نظمِ خلافت بظاہر خلیفہ کی مرضی کے مطابق چلتا رہتا ہے، چاہے اس کے احکام بعض لوگوں کے دلوں پر گراں ہی کیوں نہ گذریں۔ اس نوعیت کی خلافت "خلافتِ مفتونہ" کہلاتی ہے۔ اس طرح خلافتِ منتظمہ کی بھی دو قسمیں ہوگئیں:-

۱۔ "خلافتِ محفوظہ"، مثلاً خلافتِ شیخینؓ۔

۲۔ خلافتِ مفتونہ، مثلاً خلافت ذی النورینؓ۔

ان میں سے خلافتِ محفوظہ جمہور بنی آدم بلکہ اس پوری دنیا کے لیے نعمتِ عظمیٰ اور سعادتِ کبریٰ کا حکم رکھتی اور اس صورت میں خلافتِ راشدہ ہر پہلو سے موجود رہتی ہے، وجودِ خلیفۂ راشد کے اعتبار سے بھی، ظاہری نظمِ ملت کے لحاظ سے بھی اور لوگوں کے مطمئن و مطیع ہونے کے پہلو سے بھی۔ لیکن خلافتِ مفتونہ کا معاملہ اس کے خلاف ہے۔ بلاشبہ اس میں خلیفۂ راشد موجود ہوتا ہے اور عوام کے مختلف طبقات میں بظاہر نظم بھی کارفرما ہے، مگر اہلِ زمانہ کی بے اطمینانی کے پہلو سے دیکھا جائے تو اصولاً یہ شے مفقود کے حکم میں ہے۔ اسی بنا پر بعض حدیثوں میں اشارہ ہے کہ خلافت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ختم ہوگئی۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

بینا انا نائم رایتنی فی قلیب، علیها دلو، فنزعت منها ما شاء الله، ثم اخذها ابن ابی قحافه، فنزع منها ذنوبا او ذنوبین وفی نزعه ضعف، والله یغفر له ضعفه، ثم اخذها ابن الخطاب عن ید ابی بکر، فاستحالت فی یده غربا فلم ار عبقریا یفری فریه حتی روی الناس وضربوا بالعطن۔

میں سو رہا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو ایک کنوئیں پر دیکھا جس پر ایک ڈول رکھا ہوا ہے۔ سو میں نے حسب رضائے الٰہی پانی نکالا، پھر ڈول ابن ابی قحافہ نے لیا اور اس میں سے ایک یا دو ڈول کھینچے اور ان کے کھینچنے میں کمزوری کی تھی، خدا ان کی اس کمزوری سے درگذر کرے۔ پھر ڈول ابی بکرؓ کے ہاتھ سے ابن الخطابؓ نے لیا اور ان کے ہاتھوں میں جاکر اس نے چرس کی شکل اختیار کرلی، جسے انھوں نے اس عمدگی سے کھینچا کہ کوئی پہلوان کیا کھینچے گا، یہاں تک کہ لوگوں نے سیراب ہوکر ڈیرے ڈال دیے۔

مگر ان مختلف صورتوں میں خلفائے راشدین کے درمیان جو فرقِ مراتب خلافت کے انتشار و انتظام کے پہلو سے پایا جاتا ہے وہ عارضی ہے۔ اس کو اصل منصبِ خلافت سے کوئی تعلق نہیں، جس طرح حضرات انبیائے کرام میں جو فرقِ مراتب ظہورِ ہدایت کی کمی بیشی کے اعتبار سے ہے، اس کو منصبِ رسالت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نبی بہرحال نبی ہے اور خلیفۂ راشد بہرحال خلیفۂ راشد ہے۔

اب یہاں چند حقائق مطلق خلیفۂ راشد کی نسبت بیان کیے جاتے ہیں۔

اصطلاح خلیفۂ راشد کا اطلاق خلیفۂ راشد سے مراد وہ شخص ہے جو منصبِ امامت (نیابتِ انبیاء) پر فائز ہو اور اس سے سیاستِ ایمانی کے تمام مطالبات پورے ہوں۔ یہ صفت جس شخص میں بھی پائی جائے وہ خلیفۂ برحق ہے، خواہ وہ ماضی میں ظاہر ہو یا مستقبل میں، اوائلِ امت میں نمودار ہو یا اواخرِ امت میں، فاطمی الحسب ہو یا ہاشمی النسب، قصوی الاصل ہو یا قریشی النسل۔

یہ دھوکا نہ کھانا چاہیے کہ لفظ "خلیفہ" (یا خلیفۂ راشد) بمنزلہ "خلیل اللہ"، "کلیم اللہ"، "روح اللہ"، "حبیب اللہ"، "صدیقِ اکبر"، "فاروقِ اعظم"، "ذی النورین"، "مرتضیٰ"، "مجتبیٰ"، "سید الشہداء" وغیرہ کے ہے۔ یہ سارے الفاظ مخصوص القاب ہیں، جن سے ہر لقب کسی نہ کسی خاص دینی برگزیدہ ہستی کے لیے مخصوص ہے اور اس کے اطلاق سے وہی خاص ہستی منصور ہوتی ہے۔ اسی بات کو ایک

دوسرے انداز میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ خلفائے راشدین کی اصطلاح خلفائے اربعہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے لیے ہرگز مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ اس لقب کو ویسا ہی ایک لقب سمجھنا چاہیے جیسے "ولی اللہ"، "مجتہد"، "عالم"، "زاہد"، "فقیہہ"، "متکلم"، "حافظ"، "بادشاہ"، "امیر"، "وزیر" وغیرہ القاب ہیں۔ ان القاب میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے اطلاق سے ایک ہی شخص متعین مراد لیا جائے اور خاص اسی کی کسی صفت کی طرف ذہن منتقل ہو سکے۔ یہ بات نہیں، بلکہ ان کا اطلاق جس وصف پر ہوتا ہے اس سے جو بھی متصف ہوگا، اسی کو ان میں سے کوئی لقب دیا جا سکے گا۔

مختصر یہ کہ جیسے کبھی دریائے رحمت جوش میں آیا تو کسی امام ہدایت (یعنی نبی) کا ظہور ہو گیا۔ اسی طرح جب بھی اللہ کا کمال بندہ نوازی بروئے کار آتا ہے تو کسی امام برحق کو تخت خلافت پر جلوہ گر کر دیتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اسے اپنے وقت کا خلیفۂ راشد نہ قرار دیا جائے۔ حدیث کی پیشینگوئی اس دعویٰ کی تردید نہیں کرتی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت راشدہ فقط تیس سال تک رہے گی اور اس کے بعد سلطنت کا دور آ جائے گا۔ کیونکہ درحقیقت اس پیشینگوئی کا مدعا صرف اس قدر ہے کہ خلافت راشدہ بر سبیل اتصال و تواتر تیس سال تک رہے گی، یہ نہیں کہ قیام خلافت صرف اتنے ہی عرصہ کے لیے خاص ہے، بس اس کے بعد ختم۔ دوسرے لفظوں میں حدیث مذکورہ سے صرف اتنی بات اخذ ہوتی ہے کہ خلافت راشدہ کا سلسلہ تیس سال گذرنے کے بعد منقطع ہو جائے گا، مگر یہ بات اخذ نہیں ہوتی کہ اس انقطاع کے بعد ابد الآباد تک اس کا لوٹنا ممکن نہیں ہے۔ ذیل کی حدیث دورِ خلافت راشدہ کے لوٹنے پر صریحاً دلالت کرتی ہے۔

تکون النبوۃ فیکم ما شاء اللہ ان تکون، ثم یرفعها اللہ تعالیٰ، ثم تکون خلافۃ علیٰ منهاج النبوۃ ما شاء اللہ ان تکون، ثم یرفعها اللہ تعالیٰ ثم یکون ملکا عاضا فیکون ما شاء اللہ ان یکون ثم یرفعها اللہ تعالیٰ، ثم تکون ملکا جبریۃ فیکون ما شاء اللہ ان یکون ثم یرفعها اللہ تعالیٰ۔ ثم تکون خلافۃ علیٰ منهج النبوۃ ـــــ ثم سکت!

جب تک اللہ چاہے گا، دورِ نبوت تم میں رہے گا۔ پھر اللہ اسے اٹھا لے گا پھر جب تک اللہ چاہے گا، خلافت علیٰ منہاج النبوت کا دور رہے گا، پھر اللہ اسے بھی اٹھا لے گا۔ پھر بادشاہی کا دور آئے گا اور اللہ جب تک چاہے گا وہ رہے گا، آخر وہ بھی اٹھا لیا جائے گا۔ پھر ظلم کی حکومت آئے گی اور رہے گی جب تک اللہ چاہے گا۔ پھر وہ بھی اٹھا لی جائے گی اور اس کے بعد پھر خلافت علیٰ منہاج النبوت کا دور آئے گا ـــــ یہ کہہ کر آنحضور نے سکوت فرمایا۔

یہی نہیں، بلکہ یہ بات بھی ثابت ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام کی خلافت بہترین قسم خلافت، یعنی "خلافتِ منتظمہ" محفوظ ہوگی۔ اسکی توصیف میں حدیث نبویؐ ناطق ہے:۔

لو لم یبق من الدنیا الا یوم لطول اللہ حتی یبعث اللہ فیہ رجلا من اهل بیتی یواطی اسمہ اسمی واسم ابیہ اسم ابی، یملأ الارض قسطا وعدلا کما ملئت ظلما وجورا

اگر دنیا میں سے ایک ہی دن باقی رہ جائے تو اللہ اسے دراز کرے گا یہاں تک کہ اس میں میرے اہل بیت میں سے ایک آدمی کو اٹھائے گا جس کا نام میرے نام پر اور جس کے باپ کا نام میرے باپ کے نام پر ہوگا۔ وہ زمین کو انصاف و عدل سے ویسے ہی بھر دے گا جیسے وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی۔

پھر:۔

اتاہ ابدال الشام وعصائب اہل العراق فیبا یعونہ	شام کے ابدال و عراق کی جماعتیں اس کے پاس آئیں گی اور اس کے ہاتھ پر بیعت کریں گی۔

نیز یہ کہ :-

ویعمل فی الناس بسنۃ نبیہم ویلقی الاسلام بجرانہ فی الارض	وہ لوگوں میں ان کے نبی کے طریقے پر عمل کرے گا اور زمین میں اسلام مستحکم کرے گا۔

مزید براں :-

یرضی عنہ ساکن السماء وساکن الارض لاتدع السماء من قطرھا شیئاً الا صبتہ مدراراً ولاتدع الارض من نباتہا شیئاً الا اخرجتہ حتی یتمنی الاحیاء الاموات	آسمان والے بھی اس سے راضی ہوں گے اور زمین والے بھی۔ آسمان بادلوں میں سے کچھ روک نہیں رکھے گا، بلکہ سب کچھ پوری طرح لنڈھا دیگا اور زمین بھی نباتات میں سے کچھ نہ روک رکھے گی، بلکہ سب کچھ اگل دے گی، حتیٰ کہ زندے مردوں کی تمنا کریں گے۔

یہ بھی کہ :-

المہدی علیہ السلام یشبہ فی الخلق	مہدی علیہ السلام صورت میں آنحضورؐ سے مشابہ ہوں گے۔

یہ جس امام برحق اور جس دورِ رحمت کی بشارت احادیث میں دی گئی ہے اسے اگر آنا ہے تو پھر اس امر میں کیا شک رہ گیا کہ خلافتِ راشدہ انقطاع کے بعد لوٹ سکتی ہے[1]

ب۔ ایک غلط فہمی کا ازالہ یہ خیال بھی نہ کرنا چاہیے کہ خلافتِ راشدہ کے فقط دو ہی ظہور ہیں، ایک وہی دورِ خلافتِ راشدہ جو اوائل امت میں گذرا یعنی خلفائے اربعہ کا دور اور دوسرا اواخر امت میں خلافتِ مہدی کا دور ـــــ اور ان دو دوروں کے درمیان پورا زمانہ تعطل کا ہے[2] کہ اس میں کبھی بھی خلافت راشدہ کا ظاہر نہیں ہوتا ہے۔ بخلاف اس شبہ کے اکثر تابعین نے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی خلافت کو خلافت راشدہ کے زیرِ عنوان شمار کیا ہے، بلکہ ان میں سے بعض نے تو عود خلافتِ راشدہ والی خبر (حدیث مذکورہ "تکون النبوۃ فیکم" الخ) کو حضرتِ موصوف کی خلافت کے ظہور ہی پر منطبق کیا ہے۔ مثلاً حضرت حبیب[3] نے اسی حدیث کو نقل کر کے اس کے فٹ نوٹ میں یہ خوش خبری لکھ کر حضرت عمر بن عبد العزیز کو بھیجی کہ :-

انی ارجوا ان تکون امیر المومنین بعد الملک العاض والجبریۃ ـــــ فسر بہ واعجبہ!	مجھے امید ہے کہ آپ اس کٹ کھنی اور استبدادی حکومت کے بعد امیر المومنین (خلیفۂ راشد) ہوں گے۔ (اس سے حضرت عمر بن عبد العزیز نہایت خوش ہوئے)

امیر المومنین موصوف نے اس بشارت کو قبول کیا اور یہ کہہ کر رد نہ کر دیا کہ یہ حدیث خلافتِ مہدی کی طرف اشارہ کرتی ہے، تم کیوں اسے دوسروں کی خلافت پر محمول کرتے ہو؟[4]

[1] اس سلسلہ کی پیشگوئیوں میں آمیزشوں کا بہت قوی شبہ ہے، مگر ان کا مرکزی مضمون بجائے خود صحیح ہے یعنی نظام حق کے دوبارہ قیام کی خبر! (ن۔ص) [2] یہی غلط فہمی آج بھی امت کے ناکارہ عناصر کے لیے سہولت پسندی کی ٹٹی بن گئی ہے۔ ان عناصر نے جدوجہد حق کا فریضہ ادا نہ کرنے کی گویا قسم کھائی ہے، اور ان کا استدلال یہی ہے کہ مہدیؑ کی بعثت سے پہلے حق کے قیام کا کوئی امکان نہیں۔ (ن۔ص) [3] یعنی شاہ صاحب یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ حدیث محولہ بالا (تکون النبوۃ) المہدی کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کا اطلاق اکثر تابعین کے خیال کے مطابق دوسروں پر بھی ہو سکتا ہے۔

ہمارے مدعا پر ایک اور حدیث نبوی (مسلم) شاہد ہے کہ :-

اذا رأیتم الرایات السود قد جاءت من قبل خراسان فأتوها ولو حبوا علی الثلج فان فیها خلیفة الله المهدی

جب تم خراسان کی طرف سے کالی نشانیاں آتی دیکھو تو وہاں پہنچو، چاہے تمہیں برف کے اوپر گھسٹ کر ہی جانا پڑے، کیونکہ وہاں مہدی خلیفۃ اللہ ہوگا۔

بات صاف ہے کہ یہ مہدی مہدئ موعود کے علاوہ ہے، کیونکہ مہدئ موعود کا ظہور مدینہ منورہ سے ہوتا ہے، نہ کہ خراسان سے نیز یہ بھی ثابت ہے کہ یہ دوسرا مہدی بھی ہوگا خلیفۃ اللہ ہی۔ کیونکہ تمام مسلمانوں کو اس کی اعانت و رفاقت پر مامور کیا گیا ہے۔

ایک اور خبر نبوی بھی ملاحظہ ہو :-

یخرج رجل من وراء النهر یقال له الحارث حراث علی مقدمته رجل یقال له منصور، یمکن لآل محمد کما مکنت قریش لرسول الله۔ وجب علی کل مسلم نصره [۱]

ماوراء النہر سے ایک شخص نکلے گا جسے "حارث حراث" کہیں گے اور منصور نامی شخص اس کا پیش رو ہوگا۔ اسے آل محمد پر قابو دے دیا جائے گا جیسے رسول اللہ کو قریش پر قابو دیا گیا ہے۔ اس کی مدد کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔

واضح رہے کہ اہل بیت میں سے یہ بزرگ جن کا مؤید حارث بتایا گیا ہے، مہدئ موعود کے علاوہ ہیں، کیونکہ مہدئ موعود کی تائید تو سب سے پہلے لشکر عرب کرے گا، نہ کہ ماوراء النہر کی فوجوں کا اجتماع [۲]

اب اس امر میں کیا شک رہ جاتا ہے کہ خلافت راشدہ کے اوائلی اور اواخری دو ادوار کے علاوہ اور ادوار بھی ہو سکتے ہیں۔ خلافت راشدہ اور مملکت ظاہرہ کا ادل بدل اس طرح ہوتا رہتا ہے، جیسے عام دنیوی نظاموں میں نظام عادلانہ اور نظام جابرانہ کا ادل بدل ہوتا ہے کہ کبھی یہ غالب ہے اور کبھی وہ متسلط۔ یونہی پہلے خلافت راشدہ کا ایک دور آتا ہے اور پھر ایک زمانہ مملکت ظاہرہ[۳] کو حاصل ہوتا ہے۔ خلافت کی ان دو قسموں کا یہ ہیر پھیر بالکل گردش لیل و نہار کی مانند ہے کہ رات کی تاریکیوں کا سینہ چیر کر دن برآمد ہوتا ہے اور نور کے دریا بہا کر پھر انھیں تاریکیوں میں جذب ہو جاتا ہے، پھر ابھرتا ہے اور پھر ڈوب جاتا ہے اور یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان کسی بھی زمانہ میں نعمت الٰہی کے نزول سے ناامید ہوں اور خلافت راشدہ کے ظہور کو

---

[۱] معلوم نہیں کہ شاہ صاحب نے اپنے دعاوی کے استدلال کا دارومدار پیشنگوئیوں والی کمزور روایات پر کیوں جا رکھا ہے جب کہ پورا قرآن خود اس دعوت پر مبنی ہے کہ خدا کے قانون کو نافذ کرنے والی خلافت راشدہ کے سوا اور کوئی سیاسی اقتدار انسانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہے، چاہے کوئی سا ملک ہو اور کوئی سا زمانہ! اور مسلمانوں کا کام یہی ہے کہ اگر خلافت حقہ کا نظام درہم برہم ہو جائے تو اسے از سر نو قائم کرنے کی کوشش میں لگ جائیں۔

[۲] یہ پیشنگوئیاں جن میں اشخاص اور مقامات کا تعین حد درجہ واضح ہے، انھیں قابل اعتماد قرار نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشنگوئیوں کا مزاج یہ نہیں ہوتا۔ ان میں بالعموم آنے والے واقعات یا اشخاص کی دھندلی نشاندہی ہوتی ہے۔ یہ کھلی کھلی پیشنگوئیاں دور فتنہ میں سیاسی اغراض کے لیے بد دیانت [illegible] یا تو گھڑی ہیں یا رسالت مآب کی پیشنگوئیوں میں نمایاں علامات گھسیڑ کر انھیں اپنے ممدوحین پر چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ (ن۔م)

[۳] "مملکت ظاہرہ" شاہ صاحب کی خاص اصطلاح ہے جس کی تفصیل تو آئندہ ابواب میں آئے گی۔ یہاں مختصراً یہ سمجھ لیجئے کہ شاہ صاحب اس اصطلاح سے اس نظام سیاست کو مراد لیتے ہیں جو "اسلامی" بھی ہو اور "اسلام" سے دور بھی ہو جائے۔ (ن۔م)

ناممکن تصور کریں۔ اس نعمت کی بھیک بہرحال میں مجیب الدعوات سے مانگنی چاہیے اور اپنی صدائے گدایانہ کے ثمر خیز ہونے کی امید لگائے رکھنی چاہیے۔ ہر لمحہ اور ہر خلیفۂ راشد کے انتظار میں کٹے اور ہر قرن کے متعلق یہی توقع رہے کہ شاید اسی میں خدا کی نعمت کاملہ ظہور پائے اور شاید اسی میں خلافت ربانی کا آفتاب طلوع کرے۔[۵۱]

ج۔ خلیفۂ راشد کی حقیقت[۵۲]

خلیفۂ راشد دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نمائندہ اور انبیاء کی مسند پر بیٹھنے کی وجہ سے گویا انہی کے گروہ کا ایک فرد ہوتا ہے۔ اس کی ذات دین حق کی ترقی کا وسیلہ ہوتی ہے۔ وہ ملائکہ مقربین کا ہمسایہ بلکہ عالم امکان کی روح رواں ہوتا ہے[۵۳] اور ساری کائنات اس پر فخر کرتی ہے۔ وہ افراد انسانی کا سرتاج اور ارباب[۵۴] عرفاں کا سرخیل ہوتا ہے۔ اس کے دل پر تجلیات ربانی کا نزول[۵۵] ہوتا ہے۔ اس کا اقبال جلالِ یزدانی کا پرتو اور اس کی محبوبیت جمال ربانی کا عکس ہوتی ہے۔ اس کا قہر تیغ قضا ہے تو اس کی مہر سرچشمۂ عطا۔ اس سے لڑنا تقدیر سے لڑنا اور اس کی مخالفت خود رب قدیر کی مخالفت ہے[۵۶]۔ اس حیثیت کے پیش نظر اگر کسی صاحب کمالات نے اس کی خدمت[۵۷] و اطاعت میں کمال نہ دکھایا تو اس کے کمالات بالکل رائگاں ہیں اور کسی صاحب علم کے علوم اگر اسی کی عظمت و کرامت کی شرح نہ کر سکے تو وہ قطعاً بے کار ہیں۔ پھر اگر کسی نے کمالات کے غرور میں اگر اس کی ہم سری[۵۸] کی تو گویا مشارکتِ حق تعالیٰ

---

[۵۱] یہ سطور شاید آج کل کے قنوطی علماء و خواص کے لیے سرچشمہ بصیرت ثابت ہوں۔ ان کی طرف سے بالعموم دعوت حق کے جواب میں یہ اعتراض پیش کیا جاتا ہے کہ نظام حق کا قیام موجودہ دور میں ممکن نہیں ہے، بلکہ اس دور کے لیے سلطنت کفر مقدر ہو چکی ہے۔ یوں تو نظام اسلامی کے حق ماننے کے بعد کسی کے لیے چارہ نہیں رہتا کہ وہ اس کے قیام کے لیے جد و جہد نہ کرے، لیکن راہ انحراف ڈھونڈ نکالنے میں جن لوگوں کو مہارت حاصل ہے، انھوں نے نبوت کی دو ایک پیشنگوئیوں کی ڈھال پر پورے قرآن کی مرکزی دعوت کے وار کو روک دکھایا ہے۔ شاہ صاحب ان سطور کے ذریعہ اسی ڈھال کو توڑ دینا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کو نظم حق کے قیام کے لیے اکسا دینا چاہتے ہیں۔ (ن۔ص)

[۵۲] خلیفۂ راشد کی دینی حیثیت کو متعین کرنے سے مقصود یہ ہے کہ مسلمان ٹھیک ٹھیک جان لیں کہ اس سے کس طور سے معاملہ کرنا صحیح ہوگا اور کس طور سے غلط۔ (ن۔ص)

[۵۳] دین حق کے نفاذ سے نظام تمدن انسانی پورے ہنگامۂ کائنات سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور انسان کے تشریعی و طبعی دائرہ ہائے حیات میں کوئی فساد اور کوئی تصادم باقی نہیں رہتا۔ پس دین حق کا حفظ و قیام جس ہستی کا مرہون منت ہوتا ہے اس سے کائنات کا ایک ایک ذرہ طمانیت حاصل کرتا ہے۔ (ن۔ص)

[۵۴] مراد یہ کہ اسلام کے اجتماعی نظم اور اس کی روح کو غالب کرنے اور اسے پرورش دینے کا عظیم الشان فریضہ جس نے اپنے ذمہ لیا ہو، تقویٰ و عرفان کی اونچی سے اونچی منزل اس کے قدم چومتی ہے۔ یہی منتہا ہے عبودیت و عرفان کا۔ (ن۔ص)

[۵۵] تجلیات ربانی کے مفہوم میں وہ کیفیات یقین و اذعان، وہ بصیرت دینی اور وہ صلاحیت امتیاز حق و باطل ہے جو دین حق کے سچے خادموں کے لیے مخصوص ہیں۔ (ن۔ص)

[۵۶] ان جملوں کا منشا واضح ہے کہ خلیفۂ راشد کا اقتدار چنگیز و ہلاکو کے اقتدار کی طرح رضائے الٰہی سے ہٹا ہوا نہیں ہے۔ وہ خدا کی حکومت کا ناظم ہے۔ پس اس ناظم سے جو الجھا اس نے درحقیقت خدا ہی سے الجھنے کی حماقت کی۔ (ن۔ص)

[۵۷] یہاں شخصی و ذاتی خدمت و اطاعت کا ذکر نہیں ہے۔ شخصی طور پر تو خلیفہ یا امیر اگر کوئی چیز کسی سے طلب کرتا ہے یا کسی کی اعانت چاہتا ہے تو اس کی حیثیت محض ایک "سائل" کی ہے۔ (ن۔ص)

[۵۸] قانونی و اخلاقی ہم سری کی نفی نہیں کی جا رہی، بلکہ سیاسی حیثیت میں اس کی ہم سری کو جرم قرار دیا گیا ہے، یعنی بحیثیت صاحب امر اس کو جو خاص مرتبہ نظام دینی میں حاصل ہے اس میں کسی قسم کی حصہ داری کا دعا جائز نہیں ہے۔ اس مرتبۂ خاص کی توضیح شاہ صاحب نے آئندہ سطور میں نہایت اچھی طرح کر دی ہے۔ (ن۔ص)

راہ میں قدم رکھا۔ اہل کمال کی تو پہچان ہی یہی ہے کہ وہ خلیفۂ راشد کی خدمت و اطاعت میں اپنی پوری قوتیں صرف کردیں اور اس کی برابری کے دعویٰ سے دستبردار ہوجائیں، کیونکہ وہ صحیح معنوں میں حضور رسالتمآب کا جانشین ہے۔

زیادہ صاف لفظوں میں اگر کہنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ خلیفۂ راشد "نبیٔ حکمی" دینی مجازی ہوتا ہے، یعنی اگرچہ وہ فی الحقیقت نبوۃ و رسالت کو نہیں پہنچتا لیکن منصب خلافت پر متمکن ہونے کی وجہ سے انبیاء اللہ سے اس کو بعض امور میں مماثلتیں حاصل ہیں[۵۵]۔ ان مماثلتوں کا مفصل بیان تو انشاء اللہ آئندہ ابواب میں آئے گا۔ البتہ یہاں ان میں سے بطور نمونہ دو چار چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ اطاعتِ خلیفہ پر نجات اخروی کا انحصار :— خدا کے رسولوں پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص معرفتِ الٰہی اور تہذیب نفس میں کمال حاصل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور کیوں نہ لگادے، نجات اخروی کا حقدار نہیں ہوسکتا۔ اور کوئی طاقت خداوند جبار کے غضب اور ابدی دہکتی ہوئی دوزخ سے اسے بچا نہیں سکتی۔ بالکل اسی طرح عبادات شرعیہ اور طاعات دینیہ کی بجاآوری میں کوئی شخص کتنا ہی خون پسینہ ایک کردے، اور اسلام کے امتثالِ امر میں کتنی ہی جد و جہد کا مظاہرہ کرے، امام وقت کی امامت کو صاف صاف تسلیم کیے بغیر اور اس کی اطاعت کے لیے گردن جھکائے بغیر خدائے قہار کی دار و گیر سے مخلصی نہیں پاسکتا۔ وہ زہد و تقدس اور وہ طاعتیں اور عبادتیں جو خلیفۂ راشد کی اطاعت سے باہر رہ کر سرانجام دی جائیں، آخرت میں رائی کے دانے جتنا وزن بھی نہیں پاسکتیں[۵۶]۔

ملاحظہ ہو حدیث :-

من لم یعرف امام زمانہ فقد مات میتۃ جاھلیۃ

جس نے اپنے وقت کے امام کو نہ مانا وہ جاہلیت کی موت مرا۔

پھر :-

صلوا خمسکم وصوموا شھرکم وادوا زکوۃ اموالکم واطیعوا اذا امرکم تدخلوا جنۃ ربکم

پانچ وقت کی نمازیں ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو، اپنے مالوں کی زکوۃ دو، اپنے امرا کی اطاعت کرو، اپنے رب کی جنت میں داخل ہوگے۔

دوسری حدیث ہے :-

---

[۵۵] ان الفاظ سے کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ ان کا مفہوم یہ ہے کہ نبی کی حیثیت نبوت و رسالت (یعنی مورد الہام ہونا، احکام الٰہی کا مستند و عملی شارح ہونا، امت کے لیے دائمی اسوہ ہونا) میں تو خلفا شریک نہیں ہیں مگر اس کی حیثیتِ امارت (یعنی احکام الٰہی کو بندوں پر نافذ کرنے اور رضائے الٰہی کے مطابق سیاستِ ایمانی کو چلانے کا منصب) اس کے مخلص جانشینوں کی طرف منتقل ہوجاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نبی کی امارت اور خلیفہ کی امارت میں فرق ہوتا ہے مگر اس فرق کے باوجود دونوں کے منصب امامت میں بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے اور دونوں قسم کی امارتوں پر اکثر حالتوں میں ایک ہی حکم لگایا جاتا ہے۔ (ن۔ ص)

[۵۶] اسلام ایک اجتماعی دین ہے۔ اس وجہ سے یہ کسی کو اپنے نظم اجتماعی سے علیحدہ ہوکر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس نظم سے کوئی پرزہ خواہ کتنی ہی اچھی دھات سے ڈھالا گیا ہو اور کتنی ہی صفائی سے بنایا گیا ہو اور کتنا ہی خوبی سے اسے صیقل کیا گیا ہو، نظام حق کی مشین میں فٹ نہ ہوا تو وہ دو کوڑی کی قیمت بھی نہیں پاسکتا بخلاف اس کے معمولی دھات کا ایک پیچ جو کچھ زیادہ صیقل زدہ بھی نہیں ہے، اگر نظم حق کی کل میں منصب ہوکر اس کے اجتماعی عمل میں اپنا حصہ ادا کررہا ہے، سونے کے ساتھ تلنے کا مستحق ہے (ن۔ ص)

من مات ولیس فی عنقہ بیعۃ مات میتۃ جاھلیۃ

جو شخص اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں (امام) وقت کی بیعت کا قلادہ نہیں تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔[۱]

۲۔ احکام خلیفہ کی موافقت پر عبادات کی قبولیت کا مدار:۔۔۔۔۔ یہ ظاہر ہے کہ دینی عبادات اور شرعی طاعات اگر نبوت کے مطابق ہوں تو مقبول ہوتی ہیں، ورنہ مردود۔ اسی طرح جمعہ و عیدین اور حدود و تعزیرات[۲]، اور جہاد وغیرہ فرائض کی ٹھیک ٹھیک ادائیگی صرف اس صورت میں متصور ہے کہ وہ خلیفۂ راشد کے احکام کے مطابق ہوں۔ اس کے احکام سے بے نیاز ہو کر ان فرائض کو انجام دینا آخرت میں نتیجہ خیز نہیں ہے۔ آنحضور صلعم کا ارشاد ہے:۔

انما الامام جنۃ یقاتل من ورائہ ویتقی بہ

امام وقت ڈھال ہے جس کی اوٹ میں جنگ کی جاتی ہے اور جس کے ذریعے حفاظت ہو[تی ہے]

نیز فرمایا کہ:۔

الغزو غزوان فاما من ابتغی وجہ اللہ واطاع الامام وانفق الکریمۃ ویاسر الشریک واجتنب الفساد فان نومہ ونبھہ اجر کلہ واما من غزا فخرا وریاء وسمعۃ وعصی الامام وافسد فی الارض فانہ لم یرجع بالکفاف

جہاد دو طرح کا ہوتا ہے۔ جو شخص اللہ کی خوشنودی چاہتا ہے، امیر کی اطاعت کرتا ہے، اپنا عمدہ مال خرچ کرتا ہے اور اپنے ساتھی کے ساتھ نرمی کرتا ہے، فساد سے بچتا ہے تو اس کا سونا اور جاگنا کل کا کل اس کے لیے اجر ہے۔ جو شخص فخر، نمائش اور شہرت طلبی کے لیے جہاد کرتا ہے اور امام کی نافرمانی کرتا ہے اور زمین میں فساد کرتا ہے اس کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔

۳۔ معاملات انسانی میں حکم نفاذ:۔۔۔۔۔ نبیؐ وقت جب دو شخصوں کے درمیان کسی قسم کے معاملہ کے انعقاد کا حکم لگاتا ہے، مثلاً نکاح یا بیع وغیرہ امور میں، تو پھر وہ معاملہ اس حکم کی وجہ سے خود بخود منعقد ہو جاتا ہے اور پھر کسی کو اس میں چون وچرا کا حق نہیں رہتا۔ اس حقیقت کو حق جل وعلیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے:۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ

کسی مسلمان مرد اور کسی مسلمان عورت کے لیے یہ روا نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ میں فیصلہ دے دیں، تو اپنے معاملہ میں انھیں پھر بھی اختیار [باقی رہے]

نبی کے بعد یہ سارے معاملات خلیفۂ راشد یا اس کے ماتحت قاضی کے حکم سے منعقد ہوتے ہیں۔ اس کے فیصلوں میں بھی کسی کے لیے مجال گفتگو باقی نہیں رہتی۔ جیسا کہ مختلف کتب دینی اور ان کی شرحوں میں مسئلہ "قضاء القاضی ینفذ ظاہراً و باطناً" (قاضی کا فیصلہ ظاہر و باطن ہر لحاظ سے نافذ ہے) کا تذکرہ صراحۃً موجود ہے۔

۴۔ حکم خلیفہ کا حجت شرعی ہونا:۔۔۔۔۔ کون نہیں جانتا ہے کہ نبی کا حکم احکام شریعت کو ثابت کرنے میں دلیل کی حیثیت رکھتا ہے

---

[۱] اس نوعیت کی روایات و احادیث کو بہت غلط طریقہ سے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ ان کے متعلق یہ بات طے ہے کہ یہ خلیفۂ راشد یا امام برحق سے مخصوص ہیں۔ ان کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر امام برحق موجود نہ ہو تو ہر کس و ناکس جو بھی سامنے آئے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لو۔ (ن۔ص)

[۲] یعنی جمعہ و عیدین صرف امام یا اس کے نائب مجاز کی امامت میں ادا ہوں گے، اسی طرح حدود و تعزیرات کا اجرا بھی اس کے حکم کے ماتحت ہو گا، اور جنگ و صلح کے معاملات بھی اسی کے حکم سے طے پائیں گے۔ یہ جائز نہیں ہے کہ امام کے فیصلہ کے بغیر جس کا جی چاہے جنگ کو نکل کھڑا ہو اور جس کا جی چاہے کسی پر الزام قائم کر کے بطور خود کوئی سزا دے دے (ن۔ص)

یعنی کسی قول یا فعل میں ہزار فائدے اور نقصان نظر آئیں اور عقل لاکھ کسی امر کے حسن و قبح کو ثابت کرے، لیکن جب تک کتاب منزل اور نبیٔ مرسل کی طرف سے کوئی نص اس کے وجوب یا اس کی حرمت پر دلالت نہ کرے، اس کا فرض یا حرام ہونا شریعت میں ثابت نہیں ہو سکتا۔

بالکل ایسی ہی سیاسی معاملات سے تعلق رکھنے والے کسی قول و فعل میں کتنے ہی فوائد کیوں نہ متصور و متیقن ہوں، امام وقت یا اس کے نائب کے فیصلے کے بغیر شرعاً انھیں کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوگی تو اس قول و فعل کا وجوب ہرگز ثابت نہیں ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس کسی دعوی کی صحت و بطلان یا کسی حد و تعزیر کے ثبوت کے لیے سیکڑوں دلائل کا ہونا اور بیسیوں گواہوں کا گواہی دینا بالکل عبث ہے، جب تک کہ امام یا اس کے نائب کا حکم ان پر چسپاں ہو کر انھیں پایۂ ثبوت پر نہ پہنچاوے۔

پس جس طرح اصل احکام شریعت کو نص نبوی ثابت کرتی ہے، اور ان کے ساتھ مختلف امور کے حسن و قبح پر جو عقلی استدلال کیا جاتا ہے وہ محض مخاطبین کی تسلئ خاطر اور مخالفین کے اعتراضات کی تردید کے لیے ہوتا ہے، اسی طرح معاہدات و معاملات اور حدود و تعزیرات کا نافذ و منعقد ہونا امام اور اس کے نائب مجاز کے حکم پر منحصر ہے۔ اس حکم کے ساتھ اگر گواہوں کی گواہی کا اظہار اور کسی صورت معاملہ کے نفع و نقصان کی تشریح ہوتی ہے تو وہ صرف متعلقین معاملہ کی تسلئ خاطر اور مخالفین کے الزام کو روکنے کے لیے ہوتی ہے کہ وہ کسی صورت معاملہ کو ظلم و جور پر محمول نہ کریں۔

۵۔ خلیفہ کے احکام کا نصِ مجازی ہونا:— جس طرح مجتہدین کے اجتہادات اور اربابِ قیاس کے قیاسات خدا و رسول کی نصِ قطعی کے خلاف واقع ہونے کی صورت میں پایۂ اعتبار سے گر جاتے ہیں اور اسی مخالفتِ نص کی وجہ سے عملاً ان کا اتباع نہیں کیا جاتا، اسی طرح امام اور اس کے نائب مجاز کے احکام سے متعارض ہونے کی صورت میں بھی اجتہادات و قیاسات بلاشبہ پایۂ اعتبار سے گر جاتے ہیں۔ پس دو مختلف اجتہادی و قیاسی آرا میں سے حکمِ امام جس کی تصدیق و تائید کرے گا، اس کو واجب الاذعان جاننا امت کے ہر فرد کے لیے ضروری ہے، چاہے کوئی مجتہد ہو یا مقلد، عالم ہو یا عامی، عارف ہو یا غیر عارف! کسی کو اپنے یا مجتہدین سلف کے اجتہادات، اور اسی طرح اپنے یا شیوخ متقدمین کے مکاشفات کے بل پر امام برحق[1] سے معارضہ کرنا روا نہیں ہے۔ امورِ مذکورۃ الصدر میں جس کسی نے حکم امام کے خلاف کوئی دوسری راہ اپنے لیے پسند کی وہ یقیناً عند اللہ مجرم ہے اور اس کا کوئی عذر رب العلمین کے حضور میں یا انبیاء و مرسلین کی بارگاہ میں یا علمائے مجتہدین کی نگاہ میں مسموع نہیں ہے، کیونکہ یہ ایک اجماعی مسئلہ ہے اور اہل اسلام میں سے کسی کو اس میں اختلاف نہیں ہے۔

۶۔ خلیفہ کے مقرر کردہ قوانین سیاست کا "سنت" کی تعریف میں ہونا:— نبی خدا کے کسی فرمودہ کے ماتحت جزئی امور میں جو حدود و عمل مقرر کرتا ہے ان سے اسی طرح استدلال و تمسک کیا جاتا ہے، جس طرح فرمودۂ الٰہی سے۔ اسی طرح خلیفۂ ارشد کتاب و سنت کی حدود میں رہتے ہوئے، جن جن سیاسی قوانین اور ریاستی ضوابط کو نافذ کرتا ہے ان سے بالکل سنت نبوی کی

[1] امام برحق کے اجتہادی احکام کی یہ حیثیت "عمل" کے ساتھ مخصوص ہے۔ نظری طور پر استنباطی امور میں اس سے اختلاف رائے کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً خلیفۂ برحق اول وقت پر نماز پڑھنے کا قائل ہے تو مسلمانوں کے لیے یہ لازم ہوگا کہ وہ اس کی امامت میں اول وقت ہی نماز ادا کریں، ہاں اس امر کی گنجائش رہے گی کہ کوئی شخص علمی طور پر نماز کو موخر کرنا پسند کرے۔ (ن۔ ص)

طرح مناظرات و معاملات میں استدلال و تمسک کرنا بجا و درست ہے، کیونکہ خلیفۂ راشد کے استنباط کردہ قوانین بدعت کی تعریف میں نہیں آتے، بلکہ سنت نبوی کے دائرہ میں شمار ہوتے ہیں۔

اس مضمون پر حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) گواہ ہے:۔

انہ من یعیش منکم بعدی فسیری اختلافاً کثیراً، فعلیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المہدیین۔ تمسکوا بہا وعضوا علیہا بالنواجذ وایاکم ومحدثات الامور، فان کل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ

تم میں سے جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ بہت سے اختلافات دیکھیں گے تو تمہارے اوپر لازم ہے کہ میرے اور خلفائے راشدین کے طریقے کی پیروی کرو۔ ان کو مضبوطی سے پکڑو اور دین میں جو نئی باتیں پیدا کی گئی ہیں ان سے بچو کیونکہ ہر نئی بات جو دین میں پیدا کی گئی وہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اختلافات میں کسی خلیفۂ راشد کے طریقہ سے استدلال کرنا موجب ہدایت ہے اور یہ کہ خلیفۂ راشد بدعت سے بری ہے۔

۷۔ احکام خلیفۂ راشد کا متمم سنت ہونا:۔۔۔ حکیم مطلق نے شریعت کے اصولی احکام کو تو اپنی نازل کردہ کتاب میں بیان فرما دیا ہے لیکن ان کی فروع اور شرائط کا تعین نبی کے ذمہ کر دیا۔ مثلاً اس نے اپنی کتاب میں نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا مجمل حکم دے دیا ہے، لیکن نماز کے باب میں اوقات اور رکعات کی تعداد اور ارکان و شرائط کی وضاحت کو، اور اسی طرح زکوٰۃ کے باب میں اموال زکوٰۃ نصاب زکوٰۃ اور شرح زکوٰۃ وغیرہ امور کے تعین کو اپنے رسول مقبول کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ دین کا لفظ خدا کی کتاب کے اصولی احکام اور حدیث مسلسل سے ثابت ہونے والے فروعات، دونوں کے پورے مجموعہ کو گھیرے ہوئے ہے اور یہ دونوں عناصر مل کر ہی شریعت کے نظام کو مکمل کرتے ہیں۔

مگر اسی طریق سے سوچیں تو شریعت کے کتنے ہی احکام ایسے ملیں گے جن میں اختلاف احوال کی وجہ سے تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً لشکر کشی بعض اوقات رضائے الٰہی کے مطابق ہوتی ہے، بعض اوقات خلاف۔ پھر لشکر کا کسی مقام میں قیام کرنا یا اس سے کوچ کرنا دیکھیے نافع بھی ہو سکتا ہے اور مضر بھی۔ پس ایسی صورت میں کسی حکم کو دائمی یا غیر متغیر نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مطلق لشکر کشی واجب ہے یا ممنوع؟ یا کون کہہ سکتا ہے کہ لشکر کے لیے مطلقاً قیام یا کوچ حلال ہے یا حرام؟ لہٰذا ان امور میں حکم لگانا اور فیصلہ دینا امام وقت کی رائے پر چھوڑا گیا ہے اور امام کے اس طرح کے احکام اور فیصلے یقیناً احکام شرعی ہی میں شمار ہوں گے، نہ کہ رسوم عرفی میں!

پس شریعت کے مفہوم میں کتاب اللہ اور حدیث نبوی کے ساتھ خلیفۃ اللہ کے احکام بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ جس طرح کتاب و سنت دین متین کے لیے اساسی حجت ہیں اسی طرح امام کے احکام بھی شریعت میں حجت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر جیسے سنت کتاب کے مقابلہ میں دوسرے درجہ پر آتی ہے، ویسے ہی حکم امام کو سنت کے مقابلہ میں دوسرا درجہ حاصل ہے۔ آخذ دین و شریعت کی صحیح ترتیب یہی ہے کہ کتاب اللہ مقدم ہے، سنت نبوی اس کے بعد ہے، اور حکم امام اس کی صراحت و وضاحت کرنے والا ہے۔ اسی ترتیب کے مطابق ایمان بالکتاب درجۂ اول ہوا، ایمان بالرسول دوسرے درجہ پر

اور خلیفۃ اللہ پر کامل اعتماد رکھنا تیسرے درجہ پر۔ بالکل یہی ترتیب کتاب اللہ میں مذکور ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے ارباب امر کی اطاعت کرو۔

اور اس آیت کی شرح فرمودۂ نبوت سے ہوتی ہے۔

عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين

تم پر میرے طریقہ کا اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقے کا اتباع لازم ہے۔

انھیں شواہد کی بنا پر علمائے امت نے امورِ غیر منصوصہ میں امیر کے قیاس و اجتہاد کی صحت کو اطاعت کی شرط نہیں مانا ہے بلکہ اس کے مجتہدانہ فیصلوں کی پیروی ہر صورت لازم قرار دی ہے، چاہے اس کا قیاس ضعیف و ناقص ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی امام کے قیاس کو اس سے لاکھ درجہ بہتر قیاس کے بل پر بھی رد نہیں کیا جا سکتا۔ بات صاف ہے کہ مجرد قیاس کتنا ہی مستند اور کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو، حکم امام کے برابر وزنی نہیں ہو سکتا، کیونکہ حکمِ امام اصولِ دین میں سے ایک اصل اور دلائلِ شرعی میں سے ایک دلیل ہے۔ خلیفہ کی مخالفت کرنے کے لیے جو قیاس وسیلہ بنتا ہے، اس میں کتنی ہی صحت و راستی ہو، وہ ظنی چیز ہے۔ مگر دوسری طرف اگرچہ خلیفہ کا حکم بھی قیاس ہی سے ماخوذ ہے مگر وہ بالکل قطعی ہے۔ یہ مسئلہ ویسا ہی ہے جیسے "اجماع" کا مسئلہ ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اجماع نظام شرعی میں ایک قطعی حجت ہے مگر غور کیجیے تو وہ بھی اپنی اکثر حالات میں حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے فقط ایک قیاس ہے، یا ایک خبر غیر مشہور ہے اور اس وجہ سے اس کے ظنی ہونے میں کوئی کلام نہیں، مگر بہتر سے بہتر قیاس سے بھی اسے رد نہیں کیا جا سکتا۔

۸۔ حکمِ خلیفہ "نصِ حکمی" (نصِ مجازی) ہے:— اس کی توضیح یہ ہے کہ کتنی ہی چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق کتاب اللہ میں سکوت اختیار کیا گیا ہے مگر سنت نبوی انھیں حرام یا واجب قرار دیتی ہے۔ یوں ہی بہت سے امور ایسے ہیں جنھیں کتاب و سنت کی رو سے نہ حتمی طور پر حرام کہا جا سکتا ہے، نہ واجب۔ ایسے امور کی حرمت یا وجوب کو حکمِ امام (نصِ حکمی ہونے کی وجہ سے) متعین کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس کا درجہ نصِ حقیقی سے فروتر مگر دوسرے تمام دلائلِ شرعی سے بلند ہے۔

۹۔ تبیینِ احکام کی ذمہ داری:— نبی کے امت میں ہوتے ہوئے اگر کوئی اخلاقی و سیاسی مسئلہ پیدا ہو یا مہمات دین میں سے کوئی مہم پیش نظر ہو تو اہل امت کے لیے یہ جائز نہیں رکھا گیا ہے کہ وہ اس کے تصفیہ میں کوئی مسابقت دکھائیں اور بطور خود اس پر قیل و قال کرتے پھریں۔ بارگاہ نبوت سے علیحدہ لوگوں کا مجالس مشاورت منعقد کرنا اور ان میں عقل، تدبیر، رائے اور قیاس کی ترکتازیاں دکھا کر کسی معاملہ کی حیثیت متعین کرنا اور اس پر حکم لگانا جرم ہے۔ اس کے بجائے چاہیے یہ کہ زیرِ نظر معاملہ میں بطور خود بالکل سکوت اختیار کریں اور اسے براہ راست حضور نبوت میں پہنچا کر اس امر کے منتظر رہیں کہ ادھر سے کیا حکم صادر ہوتا ہے اور کونسا طریق عمل متعین ہوتا ہے، کیونکہ حکم لگانا ہے ہی نبی کا منصب، امت کا کام فرماں برداری ہے۔ اس مدعا پر ذیل کی آیت روشنی ڈالتی ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ

اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول کے آگے سبقت کی کوشش نہ کرو

وَرَسُوْلِہٖ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ۔ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ○ اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

یہی حیثیت نبی کے بعد امام کی ہے اور مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ اجرائے احکام اور مہمات دینی کی انجام دہی کو امام کے حوالہ کر دیں اور اس کے ساتھ قیل و قال اور بحث و جدال نہ کرتے پھریں۔ امت کو امام کے ہوتے ہوئے، یہی نہیں کہ بطور خود کسی مہم میں اقدام نہیں کرنا چاہیے، بلکہ امام کے احترام کا تقاضا یہ ہے کہ زبانیں تک اس کے سامنے بے لگام نہ ہونے پائیں، اور لوگ اپنی آراء سے اس کے تصفیوں اور فیصلوں میں خلل نہ ڈالیں۔ مختصر یہ کہ تعیین احکام کے معاملہ میں کوئی شخص خلیفہ کی ہمسری کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ قرآن بھی اس دعویٰ پر شاہد ہے:-

وَاِذَا جَاۤءَھُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِہٖ وَلَوْ رَدُّوْہُ اِلَی الرَّسُوْلِ وَاِلٰۤی اُولِی الْاَمْرِ مِنْھُمْ لَعَلِمَہُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ ۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتُہٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّیْطٰنَ اِلَّا قَلِیْلًا

اور ان کو امن یا خوف کی کوئی بات پہنچتی ہے تب اس کو مشتہر کر دیتے ہیں۔ اور اگر اس کو رسول اور ارباب امر کے سامنے پیش کرتے تو وہ لوگ اس کو جانتے جو اس پر غور کرتے اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم شیطان کے پیچھے لگ جاتے اور کم ہی بچتے۔

خلیفۂ راشد کی حیثیت کی اس تشریح سے لازم آتا ہے کہ کاروبار خلافت کو بادشاہوں کی سیاست اور جاگیرداروں کی ریاست پر قیاس نہ کیا جائے۔ ان دنیوی اقتداروں کو اس دینی منصب سے کوئی نسبت نہیں۔ ان کی اپنی ایک حیثیت ہے اور اس کی اپنی ایک اہمیت، جن کو آپس میں گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے۔

خلاصۂ بحث: خلیفۂ راشد استعارۃً نبی کا فرزند ولی عہد ہوتا ہے اور اس کے مقابلہ میں دوسرے ائمۂ دین عام فرزندوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سعادتمند بیٹوں کی سعادت اس میں ہوتی ہے کہ جس ادب و احترام اور جس خدمت و اطاعت کا مستحق باپ کو سمجھتے ہیں، اسی کو باپ کے جانشین ہونے والے بھائی کے مقابلہ میں بجا لائیں۔ ان کا فرض ہو کہ اسے بجائے والد شمار کرتے ہوئے اس کی برابری کی ڈینگ نہ ماریں۔ ان کے لیے مرتبۂ وزارت سے آگے قدم رکھنا نازیبا ہے۔ بالکل یہی تقاضا امامانِ ہدایت کی امامت کا ہے۔ جیسی اطاعت و اعانت پیغمبر کے مقابلہ میں کی جانی چاہیے، ویسی ہی خلیفۂ راشد کے مقابلہ میں بھی واجب ہے۔ ہر امام کو اپنی زمام اختیار اس کے حوالہ کر دینی چاہیے اور تمام معاملات میں اتباع امر کے لیے گردن اس کے سامنے جھکا دینی چاہیے، خواہ خلیفہ کے مقابلہ میں وہ وجاہتِ علم و فضل کی اونچی سے اونچی منزل پر پہنچا ہوا ہو اور مقامات ولایت میں سے بلند ترین مقام پر اس کا قدم کیوں نہ جم چکا ہو۔ کسی شخص پر القاء و مکاشفات کی کتنی ہی بارش کیوں نہ ہو رہی ہو اور کسی کو خطاباتِ الٰہی کی کتنی ہی توجہ کیوں نہ حاصل ہو اور کسی کی چشم بصیرت پر کتنے ہی ابواب ہدایت کیوں نہ وا ہو جائیں، اور وہ ان سارے پہلوؤں میں خلیفہ کا ہم پلہ ہی کیوں نہ ہو، مقام اطاعت و اتباع سے آگے بڑھنے کا اسے حق نہیں پہنچتا۔ سیاست کبریٰ کا وارث اور خلافت عظمیٰ کا مالک بہرحال صرف خلیفۂ راشد ہی ہے۔ اسے اپنے جلیل الشان منصب کی وجہ سے انبیاء اولوالعزم سے مماثلت حاصل ہے۔ ادھر دوسرے تمام ارباب امامت کو بھی اگرچہ انبیاء ہی کے منصبِ ہدایت سے حصہ ملتا ہے مگر انھیں جس سرچشمہ سے یہ عہدۂ امامت ہاتھ آتا ہے، اسی سرچشمہ سے خلیفۂ راشد کی اطاعت و اعانت کا حکم بھی پہنچتا ہے۔ یہ وہی صورت ہے کہ غیر نبی ہوتے ہوئے کوئی شخص نعمت وحی سے قدرے حصہ پانے اور راہِ ہدایت میں رہبری کی سعادت حاصل کرے مگر اسے جس کریم مطلق کی بارگاہ سے یہ معزز رتبہ ملتا ہے اسی کی طرف سے

انبیاء و مرسلین کی فرماں برداری کا فریضہ ان پر عائد ہوتا ہے۔ اسی طرح ائمہ ہدایت کا معاملہ ہے کہ جس بادشاہ مطلق کی جانب سے انھیں منصب امامت عطا ہوتا ہے وہی انھیں خلیفۂ راشد کی اعانت پر مامور فرماتا ہے۔

خلیفۂ راشد کے ساتھ ائمہ ہدیٰ کے حسن معاملہ کی بہترین مثالیں ڈھونڈنی ہوں تو وہ صدیق اکبرؓ و فاروق اعظمؓ یا فاروق اعظمؓ و جناب مرتضیٰؓ یا جناب مرتضیٰؓ و جناب حسن مجتبیٰؓ کے باہمی ربط سے اخذ کی جا سکتی ہیں۔ ان حضرات نے کمالات روحانی اور فضائل نفسانی سے متصف ہونے کے باوجود اپنی زمام اختیار خلیفۂ راشد کے ہاتھوں میں دے دی تھی اور اس کی اطاعت کے لیے اپنی گردنیں جھکا دی تھیں۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔[1]

فہرست کتب موجودہ مکتبہ جماعت اسلامی

مکتبہ جماعت اسلامی کی اپنی مطبوعات میں سے مندرجہ ذیل اسوقت موجود ہیں

تجدید و احیائے دین عہ، پردہ غیر مجلد ۱۲ر، پردہ مجلد ؏ر، سلامتی کا راستہ ۶ر، اسلام اور جاہلیت ۶ر، اسلام کا سیاسی نظریہ ۶ر، ایک اہم استفتا ۲ر، راہِ عمل ۶ر، جہاد فی سبیل اللہ ۶ر، نشانِ راہ ۶ر، نیا نظام تعلیم ۶ر، معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل ۶ر، خطبۂ تقسیم اسناد ۲ر، دستور جماعت اسلامی ۲ر، مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول عہ، حصہ دوم ۱۲ر، حصہ سوم عہ، روداد جماعت اسلامی ۹ر، حصہ دوم ، اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے ۶ر، اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر ۶ر، خدا کی اطاعت کس لیے ۲ر، عبادت ۲ر، ایمان کی کسوٹی ۲ر، مسلمانوں کی طاقت کا اصلی منبع ۲ر، مسلمان کا بنیادی عقیدہ ۲ر (سفید اور خاکی) بشکل چارٹ چھوٹا سائز اور جیبی سائز۔ Towords Under Standing Islam. (دینیات کا انگریزی ترجمہ مجلد) ے ر What is Islam. ۶ر

ہماری نئی مطبوعات

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ۱۲ر، اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر عہ، روداد جماعت اسلامی حصہ سوم ، حقیقت توحید ۱۲ر

---

[1] مطلب یہ ہے کہ یہ اصحاب کمالِ علم و عمل میں بڑے اونچے مدارج پر فائز تھے اور اصولِ دین کی سمجھ میں اور اجتہاد و قیاس کی مہارت میں کسی سے پیچھے نہ تھے بلکہ ممکن ہے کہ بعض پہلوؤں میں خلیفۂ راشد سے کچھ آگے ہی بڑھے ہوئے ہوں اس کے باوجود انھوں نے فکر و عمل میں خلیفہ کی سیادت و قیادت اور اطاعت و اعانت سے کبھی گریز کرنے کی جرأت نہیں کی ــــــ تا بدیگراں چہ رسد

شاہ صاحب کی ان توضیحات سے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ نظام دینی کے ماتحت جس شخص کو امارت و خلافت کا درجہ ملتا ہے اس کی اطاعت و اعانت سیاسی حکمت کے ماتحت نہیں، بلکہ بطور دینی فریضہ کے واجب ہوتی ہے اور اس پر اخروی فلاح و خسران کا دارومدار ہے۔ (ا۔ ص)